پاکستانی قومیت کی اسلامی بنیادیں

تمہید گذشتہ ماہ لاہور میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی۔ جس میں بعض اہل علم حضرات نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس شمارہ میں ہم ڈاکٹر عبدالوحید صاحب کے قابل قدر مقالہ کو من وعن شائع کر رہے ہیں۔ دوسرے مقالے آئندہ شائع کئے جائیں گے۔

مدیر ندائے حق

اسلامی نظریۂ فکر و عمل

پاکستان کے عوام کو ایک قومی وحدت میں منتقل کرنا ہمارے ملک اور حکومت کے لئے نہایت ہی اہم اور بنیادی مسائل میں سے ہے۔ یہ کام خوش اسلوبی سے جب ہی ہو سکتا ہے کہ انہی نظریات اور عقائد کی طرف پھر سے لوٹا جائے جو تخلیق پاکستان کی تحریک کے وجود میں لانے کا باعث ہوئے تھے اور جن کی بدولت ہماری جد وجہد آزادی کو وہ عظیم کامیابی میسر آئی جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اگر ایک طرف ہم ایک سخت قسم کی متعصب مذہبی اکثریت سے دوچار تھے تو دوسری طرف غیر ملکی سامراجی طاقت کا مقابلہ کرنا تھا۔ مگر پھر بھی ان غیر معمولی اور مہیب حالات کی موجودگی میں ہم نے اپنا حق خود ارادیت حاصل کر کے ہی چھوڑا اور یہ وہ حالات تھے جو کسی اور معمولی عزم وارادے والی قوم کے پائے ثبات کو ڈگمگا دیتے۔ پاکستان کا حصول جذبۂ ایثار اور جرأت ایمانی، انتھک محنت اور لازوال قربانیوں کا ایک رزمیہ ہے۔ اس عظیم کامیابی کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ہمیں خدا کے فضل وکرم سے دور اندیش، روشن دماغ اور قابل رہنما حاصل تھے دوسرے یہ کہ اس جد وجہد میں مسلمان عوام نے اس آہنی عزم ویقین اور بے غرضانہ قربانی کا ثبوت پیش کیا جس کا لازمی صلہ پاکستان کا حصول ہی ہو سکتا ہے۔

اب وہی یقین وایمان اور وہی عقائد واحساسات، جن سے ہماری قومی زندگی میں تاب وتوانائی پیدا ہوئی تھی، پھر ہمیں ایک قومی وحدت میں منظم کرنے، ملک وقوم میں ترقی کی حرکت پیدا کرنے اور ہمارے ارادوں میں عزم اور صلابت کی روح پھونک دینے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ انہی پرانی اقدار کو پھر فکر وعمل کا محور بنائے بغیر اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہم اپنی قومی زندگی کو کسی طرح بھی صوری اور معنوی اعتبار سے باوقار اور بامعنی بنانے کے قابل ہو سکیں گے۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ان اسلامی افکار اور عقائد کا تعلق صرف ہماری روح اور اعتقاد ہی سے ہے بلکہ اس کے برعکس یہ وہ متوازن نظریہ فکر وعمل ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھتا ہے۔ کسی نظریئے کے صرف روحانی پہلوؤں پر زیادہ زور دینے کا اکثر یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اس کی مادی اور عملی ضرورتوں سے متعلق مسائل سے یکسر غفلت برتی گئی اور اس کے نتیجے کے طور پر وہ اقتصادی اور سیاسی بحران پیدا ہوا جو کسی بڑے سے بڑے نظریۂ حیات کو بھی متزلزل کر سکتا تھا۔ اس لئے اسلام

کے نظام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں دینی اور دنیوی، خارجی اور داخلی سبھی ضرورتوں کے درمیان ایک توازن برقرار رکھا گیا ہے۔

لازوال تعمیر یہ خیال محض خام ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہوگا کہ جس نظام عقائد نے عوام کے ذہنوں میں پاکستان کی فتح و کامرانی کے ابدی جھنڈے گاڑ دیئے تھے وہ اب ہماری قومی زندگی میں بے اثر اور مردہ ہو کر بیکار سی قوت بن چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قومی زندگی کی عمارت اس وقت تک مستحکم اور مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک ہم یہ تسلیم نہ کریں کہ ہمارے ان عقیدوں کو ہماری سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی میں جذب کرنا بنیادی طور پر ضروری ہے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم دنیوی سطح پر اور عقلی طور پر اپنے مسائل کو حل کرنے کی عملی کوشش نہ کریں۔ اس وقت ہمارے سامنے بے شمار مسائل ہیں جن کا عوام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ان مسائل کو عقلی طور پر حل کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے عقائد اور نظریات کی عملی ترویج اور نشوونما اور ان کے لئے عوام کے دلوں میں احترام کا برقرار رکھنا، انہی مسائل کے حل پر موقوف ہے۔ ہمارے وہ بلند اور عظیم مقاصد جو اسلامی عقائد اور افکار سے وابستہ ہیں اس وقت تک تکمیل نہیں پا سکتے جب تک کہ ملک کی سیاسی اور اقتصادی فضا خوشگوار اور ہموار نہیں ہو جاتی۔ اعلیٰ عقیدوں کی ترقی کے لئے عملی زندگی کی اصلاح اور درستی بھی ضروری ہے۔

ہماری قومی زندگی پر کچھ عرصہ پہلے تک جو جمود طاری رہا اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ قوم کو اپنے پرانے عقیدوں پر یقین نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ جن لوگوں پر ان عقائد کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی انہوں نے ذاتی مصلحتوں کی بنا پر آسانی اسی میں سمجھی کہ ان افکار و مسائل کو محض نظریاتی اور علمی بحث بنائے رکھیں کیونکہ اس طرح انہیں عظیم قومی ذمہ داریوں اور ملکی پیچیدہ مسائل کے حل کرنے سے بچنے کے لئے ایک راہ فرار مل سکتی تھی۔ یکے بعد دیگرے کئی وزارتوں کی بے عملی اور ضروری مسائل کو حل کرنے کی طرف سے بے اعتنائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں ایک عام بے دلی اور ذہنی ابتری پھیل گئی۔ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ زندگی کی اعلیٰ قدروں کی طرف سے بے تعلق سے ہو گئے اور اس قومی افتخار اور وقار کے جذبے سے عاری ہو گئے جو کسی زندہ قوم کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلامی نظام فکر و عمل ہی ایک متوازن نظام ہے۔ اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ہم نے جب ایک الگ قوم ہونے کا مطالبہ کیا تو اس کے پیچھے ہمارے روحانی اور ثقافتی ورثوں کے تحفظ کا جذبہ ہی کارفرما نہ تھا بلکہ وہاں دنیوی، اقتصادی، سیاسی اور جغرافیائی تقاضے بھی یکسر موجود تھے۔ لہٰذا اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے انہی عقیدوں پر ہم پھر سے ایمان لے آئیں اور ان کے ذریعے اپنے قومی، معاشی اور دیگر مسائل کے حل تلاش کر کے ان عقائد کو عملی جامہ پہنائیں۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ ہمارے روزمرہ کے مسائل زندگی کا صحیح صحیح عقلی اور سائنٹفک حل جلد از جلد ہمیں حاصل ہو جائے۔ ہمارے سیاسی عقائد سے متعلق از سر نو وضاحت اور تشریح کا مطالبہ صرف اسی بدگمانی اور بداعتقادی ہی کی بنا پر سر اٹھا سکتا ہے کہ ہمیں اپنے نظام عقائد کے ذریعے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی گتھیوں کے سلجھانے کی صلاحیت میں شک ہو اور ہمیں یوں محسوس ہو رہا

ہو کہ گویا وہ عقائد ہماری عملی زندگی میں غیر مؤثر ہیں۔

اسلامی نظام کی عقلی اساس

اسلامی نظام عقائد عقل سے ثابت کئے جا سکتے ہیں اور اس کے بنیادی اصول عقل، انصاف اور اعتدال سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ لہذا یہ ضرورت ہی لاحق نہیں ہوتی کہ ہم نئے سرے سے ان مسائل کا فکری یا اعتقادی رنگ میں کوئی حل تلاش کریں۔ دنیوی امور کے ایسے تمام حل جو عدل و انصاف، عقل سلیم اور فطرت کے اصولوں کے مطابق ہوں وہ ہمارے انہی اساسی عقائد کے عین مطابق ہیں۔ یہ ہمارے بنیادی عقیدے میں ہے کہ زندگی کے معاملات اور عملی مشکلات کو ہر مومن خدا کی دی ہوئی عقل سلیم اور فراست کی روشنی میں حل کر سکتا ہے۔ عملی معاملات میں فراست اور تجربے سے استفادہ کرنا عملے دینی عقائد کے عین مطابق ہے۔ اسلام کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا ایسا مذہب یا مشرب ہو جس کے عقیدے کا یہ بنیادی ستون ہو کہ اس مذہب کے پیرو اپنے ہادی کے دنیوی معمولات اور تجربات کو اپنے لئے روزمرہ کی زندگی میں مشعل راہ بنائیں۔ ایسے عقائد کا زندگی کے عملی پہلوؤں سے گہرے تعلق کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی تجربے کی وسیع پنہائیوں کے صحیح مقام اور مرتبہ کا بھی نشان ملتا ہے۔ لہذا ہمارے قومی اور معاشی معاملات کے لئے عقلی اور سائنٹفک حل کی موجودگی میں کسی نئے حل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ افسوس ہے کہ بعض اوقات اسی قسم کی چیزوں کی آڑ لے کر ملکی مسائل اور معاملات کے حل کو معرض التوا میں ڈالا جاتا رہا ہے۔ جس کے باعث ہمارے ملک کے لوگوں کے مصائب میں اس قدر اضافہ ہوا کہ وہ زندگی کی بلند ترین اقدار تک کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہو گئے۔

اسلامی ملکوں کی اقتصادی بدحالی اور پس ماندگی کی ذمہ داری بھی اسلامی عقیدے پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ دور میں ان ملکوں کا پس ماندہ رہ جانا اسلامی عقیدہ رکھنے کی وجہ سے نہیں۔ اسلامی نظام عقائد تو سراسر ترقی پسندانہ ہے اور بنیادی طور پر ایک متحرک، توانا اور جاندار سلسلہ فکر و عمل ہے۔ جس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا لے۔

غرض اس کو ہر لحظہ زندگی کی نئی طاقتوں سے حیات نو حاصل کرنے کی بے نظیر قوت حاصل ہے اس کے برعکس ہماری پس ماندگی کا شاید زیادہ قابل قبول سبب یہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنے دنیوی مسائل کو صحیح اسلامی اصولوں کے تحت حل کرنے سے غافل رہے ہیں۔ اور اپنے اساسی عقائد کی فعال قوتوں کو ہم نے سرے سے ہی نظر انداز کئے رکھا ہے۔ محض عقیدے اور افکار ہی انہیں عملی قوت دیئے بغیر زندگی کی کامرانیوں اور سماج کی خوشحالیوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ زان سے معاشرے کو کوئی ترقی ہی مل سکتی ہے۔ عقیدہ اور عمل دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے اور اسلامی نظام عقائد اسی رابطے کا ترجمان ہے۔

تاریخ اسلام کا زرین دور وہ تھا جس میں قوم کے رہنما سادہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بڑے انہماک کے ساتھ ان مسائل کے حل کرنے میں مصروف رہتے تھے، جن کا تعلق غریبوں، بیماروں، مصیبت زدہ اور بے نوا لوگوں کی فلاح اور بہبود سے ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی زندگیوں پر غور کیجئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر غمزدہ لوگوں کی

دلداری، مظلوموں کی حمایت اور کثیر العیال مگر نادار لوگوں کی معاشی دقتوں کے دور کرنے میں لگے رہے۔ ان اوصاف حسنہ اور اسی قسم کے قوت بخش عمل اور کردار کے نمونے پیش کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام کے عہد پارینہ میں مسلمانوں سے وہ قابل فخر کارنامے ظہور میں آئے، جن کی وجہ سے ہماری تاریخ کے اوراق آج تک درخشاں اور تابناک ہیں۔ اور اب پھر ہم اسی قسم کے عمل اور انہی عقائد کے احیاء اور ان پر عمل پیرا ہونے سے ترقی سے ہم کنار اور پاکستانی عوام کو خوشحالی اور سکون و اطمینان سے بہرہ ور کر سکتے ہیں۔

اسلامی فکریات کے دنیوی پہلو

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اسلامی نظام فکر میں اقتصادی اور دنیوی امور کی مستقل بالذات اہمیت ہے۔ اور جب تک ہم ان معاملات پر مناسب توجہ نہیں دیں گے اور اپنی اہم ضرورتوں میں انہیں شامل نہیں کریں گے اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اپنے اساسی عقائد کے تقاضوں کو خاطر خواہ طریق پر پورا کر رہے ہیں۔ ہمارے نظام فکر و عمل میں شخصی آزادی اور انفرادی کوشش اور قسمت آزمائی کے لئے پوری پوری ضمانت موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ نہایت ضروری بات ہوگی کہ حکومت اس چیز کا خاص خیال رکھے اور مخصوص گروہوں اور طبقوں کی اجارہ داریوں کو ترقی پانے کا موقع نہ دے۔ اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ثقافتی اور اقتصادی میدان میں اجارہ داری ختم ہو جائے گی اور تقسیم کار کے ذریعے عام لوگوں کو اس بات کا موقع ملے گا کہ وہ ہر میدان میں عملی اقدامات کے ذریعے اور اپنی کوشش اور کسب سے ترقی کر سکیں۔ اس سے لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے بڑے مواقع ملیں گے۔ لیکن اگر حکومت ہماری زندگی کے سب پہلوؤں کو کنٹرول کرنے کا حق اپنے پاس رکھے گی تو یہ عام ترقی کے امکانات کے لئے مضر اقدام ہوگا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں وہی جذبہ پھر ابھر آئے جو قیام پاکستان کے وقت ظہور میں آیا تھا، اور جس جذبے سے سرشار ہو کر ہم نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک نئی طاقت اپنے اندر محسوس کی تھی، تو ہمیں ملک میں ہر خاص و عام کو یہ یقین دلانا پڑے گا کہ اس ملک کی ترقیات میں ان کے حقوق ہر طرح محفوظ ہیں اور ان کی تقدیر اور مستقبل دونوں روشن اور تابناک ہیں۔

اسلامی اور روحانی اقدار کا یہ شعور ہمارے ذہن اور فکر کے لئے روشنی اور قوت کا باعث بن جائے گا۔ اور بالآخر یہی چیز بنی نوع انسان کے لئے وسیع تر سطح پر مفید ثابت ہوگی۔

ہمارا یہ نظام عقائد صحت مند اور معقول ہونے کے علاوہ نہایت ہی عام فہم اور عوام کے لئے دلکش اور مقبول بھی ہے اور ان کی نظر میں اس میں کوئی پیچیدگی اور گنجلک نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے مطالبے کا اتنے پرجوش طریق پر خیر مقدم کیا اور بے اندازہ قربانیوں سے اس کے حصول کو ممکن بنا دیا۔ حالانکہ اس کے خلاف مختلف اطراف سے نہایت گمراہ کن پروپیگنڈا بھی لگاتار ہوتا رہا۔ یہ عقائد اس وقت بھی اتنے مقبول ہیں کہ ان کی معمولی سی مخالفت آج بھی برداشت نہیں کی جاتی اور اگر ان سے انحراف کی کوئی کوشش بھی کسی طرف سے ظہور میں آئے تو یہ عوام کے دلوں میں دوری، بیگانگی اور نفرت کا جذبہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

یہی عقائد عوام کے ان دلی ولولوں اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جن کے بل بوتے پر پاکستان کی عمارت کا

سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اور جو آج بھی پاکستانی قومیت کی تعمیر کی حقیقی اساس ہیں۔ اور یہی ابدی زندگی اور بے پناہ قوتوں کے حامل عقائد ہمیں آئندہ بھی تاریک اور نازک گھڑیوں میں تباہی اور بربادی سے بچا سکتے ہیں۔ اور ہم میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کر سکتے ہیں اور پھر جب کہ ہم اس کو عقیدے اور تخیل کی حد تک ہی نہیں رہنے دیں گے۔ بلکہ اس کو لوگوں کے مادی آرام و آسائش اور ترقی کے لئے بھی کام میں لائیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستانی قوم منظم اور متحد ہو کر ایک طاقتور قوم بن جائے گی۔

اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں سیاسی بے یقینی کو دور کرنا ہوگا۔ اور ملک کی سیاسی زندگی کو معمول پر لا کر اقتصادی ابتری کو دور کرنا ہوگا۔ پھر کہیں جا کر اہل ملک کو اپنے وقار اور عزت کا احساس ہوگا۔ اور ہم میں ایک ایسا یقین پیدا ہو جائے گا، جس کے سہارے ہم ملک کے انتشار اور دوسری خطرناک کمزوریوں کو دور کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

اسلامی بین الاقوامیت اور پاکستانی قومیت کا سوال

اسلام ایک عظیم اخلاقی قوت ہے جو بنی نوع انسان کو ایک شیرازۂ اخوت میں جکڑتی ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ وہ تمام نسل انسانی کو ایک برادری سمجھ کر رنگ و نسل کے کسی امتیاز کے بغیر ان میں رشتہ مودت پیدا کرے۔ اس کا مجلسی، اخلاقی اور سیاسی دستور العمل کردار اور طرز حیات کے لئے ایک عملی رہنما ہے۔ اس سے زندگی بامعنی بن جاتی ہے۔ اسلام انسانوں میں زندگی کی افادیت اور کامرانی کا احساس پیدا کرتا ہے اس کے ساتھ یہ جذبہ حب الوطنی اور وطن دوستی کا مخالف بھی نہیں۔ اسلام کے متعلق اس قسم کی غلط فہمی ایک ایسا حربہ ہے جو ہمارے ملک کی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے اور اس کے شیرازے کو بکھیرنے کی ایک عیارانہ چال ہے۔ جس سے ہمیں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں استعماری اور سامراجی طاقتوں کے غلط پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس غلط فہمی کا خود ہی شکار ہو گئے تو گویا ہم بعض غرض مند بڑی طاقتوں کے اس برے ارادے میں شریک ہو کر اپنی مملکت کو خود ہی کمزور کر رہے ہوں گے۔

یہ بات صرف خیالی طور پر ہی پیش نہیں کی جا رہی بلکہ اس سے پہلے سامراجی طاقتوں نے اسلامی ملکوں کے جذبۂ حب الوطنی کی اٹھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لئے اس قسم کے حربے بارہا استعمال کئے ہیں۔

کسی قسم کی بین الاقوامیت خصوصاً اسلامی بین الاقوامیت اس وقت تک قابل عمل نظریہ نہیں بن سکتی جب تک کہ ہر ملک اپنی اپنی جگہ آزاد، بااختیار اور طاقتور نہ ہو جائے۔ اس معاملے میں اسلامی بین الاقوامیت کے لئے بھی یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر مسلم قوم پہلے اپنے ملک کے جذبہ قومیت کو حب الوطنی کے اصول پر مستحکم اور استوار کرے۔ جہاں تک کہ عالمگیر انسانی اخوت کا تعلق ہے۔ اسلام کا نظریہ بین الاقوامیت، اسلامی ملکوں کے مابین محبت اور خیر سگالی کے جذبے کے ذریعے قومیت کی تعمیر میں ایک مثبت قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تصور کے تحت تمام مسلم اقوام کو انفرادی طور پر اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے اپنی اپنی جگہ آزاد، خود مختار اور مضبوط اور طاقتور ہونا پڑے گا۔ لیکن چونکہ یہ مسلم اقوام اپنی ہم مشربیت کی بنا پر ایک اور وسیع برادری کا بھی حصہ ہیں اس لئے ان کی انفرادی قومیت اسلامی بین الاقوامیت کے دائرے میں شامل ہونے سے مانع نہیں ہو سکتی۔

اس موقع پر یہ ضرور مدِ نظر رہے کہ اسلام میں بین الاقوامیت کا جذبہ صرف مسلم اقوام کے اتحاد تک ہی محدود نہیں بلکہ اس سے وسیع تر ہے اور مسلم اقوام کو انسانی اخوت کے رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ اللہ کی نظر میں تمام انسان کنفس واحدۃ پیدا کئے گئے ہیں۔ نسل اور مذہب کے عقیدے کی قید سے بالا ہو کر اسلام نسل انسانی کی وسیع تر خیر خواہی اور بہبودی کو بھی مدنظر رکھتا ہے اس لئے مسلمان ملکوں کی بین الاقوامیت ایک معنی میں ان تک محدود ہونے کے باوجود عالمگیر اخوت کا سبق دیتی ہے۔ موجودہ زمانے میں یونائیٹڈ نیشنز قسم کی تنظیمیں اسی مسلمہ اور بنیادی اسلامی تصور کے انعکاسات ہیں اور اسلام کے لئے اس قسم کا تخیل کوئی نئی چیز نہیں۔ انسانی برادری کے اسلامی تصورات جغرافیائی اور نسل و رنگ کی قیود سے تیرہ سو سال پہلے ہی بالاتر ہو چکے ہیں۔ اسلام کے دائرے میں بے شمار قومیں اور نسلیں داخل ہوتی رہیں۔ اور اس کا یہ تجربہ آج بھی نسل انسانی کے لئے مفید ہے۔ اسی تجربے کے زیر اثر مسلمانوں میں محدود اور تنگ نظرانہ قومیت کے خلاف آج بھی ایک تنفر پایا جاتا ہے۔ اس اسلامی نظریئے کے تحت کسی متعصب اور محدود قسم کے جذبہ قومیت یا وطنیت کو ہرگز اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اخوت انسانی کے عالمگیر شیرازہ بندی کو پارہ پارہ کر دے۔ اسلامی جذبہ حب الوطنی مسلم اقوام کے افراد کو ان کے انسان ہونے کے فخر سے محروم نہیں کرتا بلکہ یہی جذبہ انہیں ایک وسیع اور عالمگیر اخوت عطا کرتا ہے۔ جس کے تحت مسلم اقوام اپنی اپنی جگہ پر کوشاں ہیں کہ دیگر اقوام بھی مناسب ارتقائی منازل طے کر کے انسانی برداری کو ایک بین الاقوامی حقیقت بنا دیں۔ جس میں تمام اقوام عالم منسلک ہو جائیں۔ اپنی معقولیت، جذبہ رواداری اور انسانی مساوات کے اصولوں کے حامل ہونے کی وجہ سے ہمارے عقائد انتہائی طور پر قابل عمل ہیں اور انہی عقائد کی وجہ سے دنیوی امور کے حل کرنے میں ہمارے لئے کوئی مشکل اور الجھن باقی نہیں رہتی۔

ہماری قومیت کے بنیادی اصول

ہماری قومیت کے اہم بنیادی اصول، اسلام یعنی پاکستان کی آبادی کی اکثریت کا ہم مذہب ہونا، ہمارے ہم وطنوں کی تاریخ کا ایک ہونا، ہماری باہمی، ثقافتی، مجلسی زندگی اور اقتصادی تقاضوں اور ضرورتوں کا اشتراک ہے۔ نیز ہماری یہ مشترک خواہش اور آرزو کہ ہم سب لوگ خطوں اور علاقوں کے امتیاز کے باوجود مل جل کر پاکستانی ہم وطنوں کی طرح ہیں۔ یہی وہ میثاق ہے۔ جو قبل تقسیم برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں نے اپنے درمیان طے کیا تھا۔ اور اسی معاہدے کی بنیاد پر انہوں نے دنیا کے روبرو اپنے عزم بالجزم کا اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے لئے ایک علیحدہ آزاد سرزمین، جسے وہ پاکستان کا نام دیں گے، حاصل کر کے اسے اپنا وطن بنائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انہی عناصر قومیت کو زندہ کیا جائے اور ان عقیدوں کو عملی جامہ پہنایا جائے جن کی خاطر پاکستان بنا تھا۔ تو ہم اپنے ملکی اور ثقافتی ورثوں کے متعلق لوگوں میں احساس فخر زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اور اسی احساس فخر کے ذریعے ہم ملک کو آئندہ کے مقاصد اور کامیابی کی منزل کی طرف بڑھنے کی ترغیب بھی دے سکتے ہیں۔

یہاں ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم پاکستانی قومیت کے بنیادی عقیدوں کے بارے میں اپنے ذہن اور

نظر کو صاف رکھیں وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ ہم ان شر انگیز ریشہ دوانیوں کی بڑھتی ہوئی رو کے خلاف جم کر صف آرا ہو جائیں جن کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے عقیدے اور تصورات پھیلائے جائیں جن کو اگر بلا روک ٹوک ترقی پانے کا موقع مل جائے تو اس کا منطقی نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ کہ ہمارا ملک انتشار اور ذہنی خلفشار کا شکار ہو کر خطوں اور علاقوں میں بٹ جائے اور ہم ایک منظم قوم ہونے کی بجائے محض چند قبیلوں اور نسلوں کا بکھرا ہوا مجموعہ ہو کر رہ جائیں۔ ہمیں اس یقین پر قائم رہنا چاہیئے کہ ہمیں بہر حال ایک متحد اور منظم قوم کی حیثیت سے رہنا ہے اور اس تخیل کا علاقوں قبیلوں اور نسلوں کی موجودگی سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو صحیح عقیدہ رکھنے کی صورت میں ذاتوں اور قبیلوں کا یہ تنوع اور رنگا رنگی ہمارے لئے بے شمار فوائد بلکہ قوت کا سرچشمہ بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم الگ الگ ہونے کے میلان سے زیادہ ایک ہونے کے میلان پر توجہ صرف کریں۔ نسلوں اور ذاتوں کا مسئلہ دنیا میں اور جگہ بھی ہے جہاں لوگوں نے اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود اپنے آپ کو ایک منظم قومیت کے اندر جذب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اقوام عالم پر اپنی قومیت کا سکہ بٹھایا ہے۔

فوری ضرورتیں

ملک میں اس منظم قومیت کے استحکام کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ اپنے مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لئے ہمیں عوام کے پر جوش تعاون کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ایسا کئے بغیر ہم ایک طاقتور قوم نہیں بن سکتے۔ عوام کا تعاون ہی برائیوں کی تمام قوتوں سے کامیاب طور پر نبرد آزما ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعے ہماری صفوں میں پھیلا ہوا انتشار دور کر کے ہمیں باوجود لسانی، ثقافتی اور نسلی امتیازات کے ایک متحد منظم اور یک جان قوم بنا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم زندگی کے ہزاروں عملی مسائل کو بھی اچھی طرح حل نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارے میں انتشار باقی ہے۔ اور مختلف سمتوں پر چلنے کا رجحان اندر ہی اندر سے تفریق پیدا کرنے کا باعث بنا رہے گا۔ ہم اپنے اقتصادی اور معاشرتی امور میں کوئی قدم اٹھا کر کسی اہم کارنامے کے انجام دینے کی توقع نہیں کر سکتے۔

اس نقطۂ نظر کی موجودگی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت اپنا زیادہ اور بیشتر وقت اور توجہ ایسے کاموں پر صرف کرے جس سے عوام کی اقتصادی اور معاشی زبوں حالی، جو انہیں زندگی کی اعلیٰ اور ارفع اقدار سے غافل کر رہی ہے، رفع ہو سکے۔ عوام کی پس ماندگی اور زبوں حالی کا بسا اوقات یہ مجموعی نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کے دل قومی تفاخر کے جذبے سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اور متحدہ قومیت کا احساس کمزور پڑ جاتا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتی ہے جس کا یہ مضبوط عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے اور انسان اس دنیا میں اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔ یہ وہی قوم ہے جس کا مجلسی نظام صحیح جمہوری اصولوں پر قائم ہے۔ اور عدل و مساوات کا وہ اصول جو اس کے پیش نظر ہے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت اپنے اعمال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہی ذمہ داری کا احساس اس کے تعلق کو حکومت سے بھی استوار

رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک سچی اسلامی حکومت دراصل خدا کی نیابت کے فرائض انجام دیتی ہے۔ اسلام میں انفرادی آزادی اور مساوات، اور قانون کی نگاہ میں سب کا برابر ہونا اور امورِ مملکت کا عوام کے مشورے کے ذریعے انجام دینے کا اصول ہمارے عقائد کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسلام نے مشاورت پر بڑا زور دیا ہے۔ اور "امرہم شوریٰ بینہم" کہہ کر ملی بہبود کے کاموں میں باشعور افراد کو بولنے اور حصہ لینے کا حق عطا کیا ہے۔

اپنے دیسی امور میں اسلامی عقائد کی رو سے سرشار ہو کر نہ صرف ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم قوم کی فلاح و بہبود کا خیال رکھیں بلکہ اپنی ثقافت کی ان طاقتوں کو بھی بروئے کار لائیں۔ جس سے ہم اپنے قومی اتحاد کو بھی بڑھا سکیں اور اپنی مجموعی قومی ذمہ داریوں کا احساس بھی بیدار کر سکیں۔ یہی اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس ثقافتی سطح پر قوم کی شیرازہ بندی اور اتحاد کی ایک بڑی قوت ثابت ہو سکتا ہے اس لئے حکومت کے اہم مقاصد میں یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ ان تمام تہذیبی عناصر کا تحفظ کرے اور انہیں ترقی دے۔ جو ہماری قوم میں وحدت کے پیدا کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہیں۔ قومی زبان کو بھی قرار واقعی ترقی دینی چاہیئے اور اس کا حق تسلیم کر کے ملکی وحدت کے اس حصے کو بھی محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ قومی طرز ماند و بود، قومی لباس اور قومی روایات کے تحفظ کے لئے بھی فوراً قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ان چیزوں سے غفلت برتی جائے گی تو ثقافتی اعتبار سے قوم یتیم اور لاوارث ہو کر اپنی تہذیب، بالآخر اپنی ہستی میں اعتقاد اور اعتماد بھی کھو بیٹھے گی اور اس طرح پہلے داخلی طور پر اور پھر خارجی طور پر ملک کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

ہمارے عقائد سے متصادم خطرات

انسانی تاریخ میں روحانی اقدار کو ہمیشہ ایک بلند مقام حاصل رہا ہے۔ یہ روحانی اقدار انسانی معاشرے کے اخلاقی اور سماجی مزاج کو صحت مند رکھنے میں بڑا کام کرتی رہی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہر زمانے میں عموماً اور آج کل خاص طور پر انسانی دنیا عقائد کی خطرناک جنگ میں الجھی ہوئی ہے۔ اور بعض اوقات عقائد کی اس جنگ میں صحت مند انسانی اقدار کو سخت خطرے اور اندیشے لاحق ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے زمانے میں اشتراکی دہریت کی قوتیں آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہیں۔ اور دوسری طرف سرمایہ دار جمہوریتیں ایک جتھے کی صورت میں اپنا غلبہ دکھا رہی ہیں۔ سیاسی عقائد کی یہ جنگ اگر ان ملکوں تک ہی محدود رہتی تو ہمیں اس سے تعرض کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن دنیا اب ایک دوسرے سے اس قدر قریب آ گئی ہے۔ کہ کوئی ملک بھی ان خارجی طاقتوں کے باہمی اقدامات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ضمن میں سیاسی عقیدوں کی اس جنگ کا ہمارے نظام فکر و عمل پر بھی اور ہماری قوم اور ملک پر بھی اثر پڑنا ناگزیر ہے۔ اس لئے ہمیں اس خطرے کی طرف سے ہرگز آنکھیں بند نہیں کرنی چاہئیں۔

اس سوال کے حل کرنے کے لئے کہ پاکستان کو ان دو مخالف نظریوں میں سے کس طرف سے زیادہ اور فوری خطرہ در پیش ہے۔ ہمیں کئی امور پر غور کرنا ہوگا اور اپنے مسائل اور معاملات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ان سیاسی جھگڑوں میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیئے۔

جغرافیائی اعتبار سے بھارت کی سرحدیں ہم سے ملی ہوئی ہیں اور ہم ان خطرات سے کسی طرح بھی غافل نہیں رہ سکتے جو اس عناد کی وجہ سے آج تک ہندوؤں کے دل اور دماغ پر چھایا ہوا ہے اور جو انہیں برصغیر ہند و پاکستان کی تقسیم اور قیام پاکستان کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے آج تک پاکستان کے نظریئے اور ہماری جداگانہ حیثیت کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ ہندو ازم سے جو خطرہ ہمیں لاحق ہے وہ ہم اپنی ہستی ہی کو خطرے میں ڈال کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ خطرہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے پاس کوئی قوی اور زوردار نظام زندگی موجود نہیں جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ان کا ملک کمیونزم یا اشتراکیت کا سب سے پہلے شکار ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے اشتراکیت کا خطرہ ہمارے اپنے گھر کے پاس آپہنچے گا اور پاکستان کی حفاظت اور سلامتی خود خطرے میں پڑ جائیگی۔ اس خطرہ سے عہدہ برا ہونے کی صورت یہی ہو کہ ہماری قومی وحدت کی بنیاد اسلامی عقائد اور کتاب و سنت پر ہو۔

اگرچہ اشتراکی ملکوں کی سرحدیں ہم سے دور ہیں مگر اس وقت تک اشتراکی ملکوں کا رویہ ہمارے متعلق خوشگوار نہیں رہا۔ ہمیں صورتِ حال کے اس پہلو کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس بارے میں حفاظتی قدم اٹھانا چاہیئے۔ اتفاق سے ہمارے ملک کے مغربی جمہوریتوں خصوصاً برطانیہ سے تاریخی تعلقات بھی ہیں اور ہم موجودہ حالت میں امریکہ کی مالی امداد سے بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ تو ایسی صورت میں ہم غیر جانبدار بھی رہیں تب بھی ان نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتے جو مندرجہ بالا دو باتوں کی وجہ سے ہماری زندگی کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ان حالات کی روشنی میں یہ تو ظاہر ہے کہ ہندو ازم کا غلبہ اور اس کے اثر و رسوخ کی زیادتی ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ بن سکتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مغربی طاقتوں کے ساتھ ہمارے بڑھتے ہوئے تعلقات اور ان کا ارتباط بھی پاکستان کے لئے ایک ایسا مسئلہ ہے جو اُن دور اس نتائج کی وجہ سے ہمارے ذہنی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔ جو ہمارے معاشرے کے مغربی طرز زندگی اور ان کے افکار و اعتقادات کے ہمارے رگ و ریشے میں سرایت کر جانے سے پیدا ہو چکے ہیں۔ بہرحال یہ امر واضح ہے کہ سب سے اوّل اور بیشتر ہمیں اشتراکیت کا مقابلہ کرنا ہے جو ہمارے عقائد سے سب سے زیادہ متصادم ہے۔

ہمیں بحیثیت مسلمان اپنا یہ فرض نبھانا ہے کہ ہم دنیا میں ایک نئے معاشرے کی تخلیق کریں۔ پاکستان اس نئے معاشرے کی تعمیر میں بنیادی حصہ لے سکتا ہے اور اپنے روحانی اور دینی عقائد کی بدولت دنیا کو ایک ایسا معاشرہ دے سکتا ہے۔ جو انسانیت کے لئے ایک پیغام اطمینان و امن ثابت ہو۔

یہ انقلاب سب سے پہلے پاکستان کے طرز حکومت اور طرز زندگی میں پیدا ہونا ضروری ہے تاکہ اس کے ذریعے دنیا کی دوسری اقوام کے لئے ایک نمونہ مہیا ہو سکے۔ اور پھر سب اسی قبیل کے معاشرے اپنے اندر پیدا کر کے تہذیب انسانی کو منزل تکمیل تک لے جانے میں کامیاب ہو سکیں۔

ہمارے دینی افکار و عقائد میانہ روی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اور انسانی اخوت کے ترجمان ہیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی خدا کے عیال ہیں۔

ایسی اُمت وسطی کہ جس کا تخیل اسلام نے دیا ہے پاکستان جیسے آزاد اور خود مختار ملک میں پیدا کی جا سکتی ہے مگر یہ جب ہی ممکن ہوگا کہ پاکستان کی بنیاد ان عقائد پر رکھی جائے جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔

ہم اپنی زندگی کی بقا اور سلامتی کو صرف ایک مستقل ارتقائی جد و جہد کے ذریعے ہی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ جس میں ہر لحظہ شعور اور تدبر کی بنا پر ہم حالات کو اپنے قومی مفادات کے لئے سازگار بناتے جائیں اور تمام قابل عمل خیالات و عقائد کو عملی جامہ پہناتے جائیں۔ بشرطیکہ یہ ہمارے اساسی عقائد و نظریات سے متصادم نہ ہوں اور فقط یہی ایک حقیقی راستہ ہے جس پر گامزن ہو کر ہم تمام بیرونی خطرات سے کامیابی کے ساتھ نبٹ سکتے ہیں۔ اور عصر حاضر کی مسلح قوتوں اور معاشی حکمت بندیوں کے دباؤ پر قابو پا سکتے ہیں۔

پاکستان میں زرعی اصلاحات کا نفاذ

حکومت کا ایک زرین کارنامہ

تعارف ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کی رات کو صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان نے مغربی پاکستان کے لئے زرعی اصلاحات کے نفاذ کا اعلان کیا جو اپنی اہمیت اور دور رس نتائج کے اعتبار سے بہت انقلابی نوعیت کی حامل ہیں "عام آدمی" کی فلاح اور اس کی زندگی کو بہتر معیار پر لانے کے لئے یہ حکومت جو کوششیں کر رہی ہے۔ اس کی طرف یہ بہت جرأت مندانہ اقدام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان زرعی اصلاحات کی ضرورت تو ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ لیکن اس سے قبل جو حکومتیں ملک میں برسر اقتدار رہی ہیں۔ ان میں نہ تو ہمت اور حوصلہ ہی تھا اور نہ نیت ہی تھی کہ وہ ایسی اصلاحات نافذ کر سکتیں۔ اس عظیم کام کو کرنے کے لئے جس جوش عمل اور خلوص نیت کی ضرورت تھی وہ ایک روح انقلاب کی متقاضی تھی اور وہ اسے موجودہ نظام حکومت کے ولولۂ خدمت کی صورت میں ہی میسر آ سکتی تھی۔

ملک کی زرعی مشکلات کی کئی قسمیں تھیں اور یہ مشکلیں بڑی ہمت شکن بھی تھیں۔ مغربی پاکستان کے علاقے میں کیفیت یہ تھی کہ (۶۲،۲۵۷،۰۰۰) ایکڑ قابل زراعت اراضی میں سے ۵۰ فیصد سے بھی کم فی الحقیقت زیر کاشت رہتی تھی اور فی ایکڑ پیداوار کا لحاظ کیا جائے تو ان زمینوں کی پیداوار تو اور بھی کم نظر آتی ہے۔ ۱۹۵۸ء تک حالت یہ تھی کہ ہمیں غیر ممالک سے ڈیڑھ ارب مالیت کا غلہ منگا کر غذائی قلت کو دور کرنا پڑتا تھا۔

غذائی قلت کے اسباب جاننے کے لئے ہمیں کچھ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ کیفیت خود اس پر روشنی ڈال رہی ہے۔ اب دیہی آبادی کو لیجئے۔ دیہی آبادی کا ۹۰ فیصد حصہ بالواسطہ یا بلا واسطہ زمین سے روزی کماتا تھا۔ اور یہاں جاگیرداری مسلط تھی۔ جس کے ہاتھوں ان کی حالت بہت زبون ہو چکی تھی۔ یہ نظام جاگیرداری ماضی کا ورثہ تھا۔ مغل اور انگریز حکمرانوں نے اپنے حلیفوں سے جو مدد لی تھی اس کے انعام کے طور پر یا آئندہ امداد کے پیش نظر